(غلام گردش)

پرانے دوست!

گزشتہ شب، ارشد چوہدری کی بیٹی کی شادی پر محض چند گھنٹوں کیلئے فیصل آباد جانے کا اتفاق ہوا۔ ارشد نے ڈویژنل پبلک سکول کے پرانے دوستوں کو مدعو کر رکھا تھا۔ پانچ دہائیوں کے طویل عرصے کے روابط بالکل تازہ ہو گئے۔ پہلی بات تو یہ شادی کی تقریب بے حد اچھی بلکہ بہترین تھی۔ ویسے ارشد بھی عجیب طبیعت کا مالک ہے۔ بڑے باپ کا بڑا بیٹا۔ والد صاحب، ڈاکٹر شفیع تقسیم برصغیر سے پہلے کے ایم بی بی ایس ڈاکٹر تھے۔ زرعی یونیورسٹی میں طویل عرصے تک کام کرتے رہے۔ پنتالیس برس پہلے، فیصل آباد میں کتنے ڈاکٹر ہونگے۔ ایک درجن یا شائد دو درجن۔ اس وقت کے ڈاکٹر کی کیا اہمیت تھی، کیا وقعت تھی، آج اسکا اندازہ بھی نہیں لگایا جا سکتا۔ دولت، سماجی حیثیت اور مراسم، ہاتھ باندھ کر سامنے کھڑے رہتے تھے۔ ویسے ارشد کے والد، کمال درویش صفت انسان تھے۔ بچپن میں جن بزرگوں کی یاد میرے ذہن پر نقش ہے، ان میں سے ڈاکٹر صاحب بھی ہیں۔

ارشد پولیس ڈیپارٹمنٹ میں گیا۔ لیکن پولیس کے منفی کلچر میں ڈھل نہ پایا۔ کبھی تھانے کا رخ نہ کیا۔ کرختگی کا ماحول اس پر اثر انداز نہ ہو پایا۔ اسی محکمہ کے ذریعے بین الاقوامی امن فورس میں تعینات ہوتا رہا۔ چند سال پہلے، خود ہی ریٹائرمنٹ لیکر گھر آ گیا۔ پہلا شخص دیکھا ہے جسے تھانیداری پسند نہیں آئی۔ جسے چوہدری بننے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ ورنہ یہاں تو، معمولی سے معمولی پوزیشن پر کام کرنے والا سرکاری اہلکار بھی فرعون سے کم نہیں۔ مگر ارشد بگڑا نہیں۔ جب پولیس ڈیپارٹمنٹ سے اُکتا گیا، تو بھرا میلہ چھوڑ کر گھر آ گیا۔ قناعت اور ایمانداری سے بھرپور زندگی گزار رہا ہے۔ بات شادی کی تقریب کی ہو رہی تھی۔ بیٹی کی شادی خیریت سے ہو جائے۔ اس سے زیادہ کسی والد کی کیا خوش قسمتی ہو سکتی ہے۔ ارشد اس لحاظ سے حد درجہ خوش نصیب انسان ہے۔

شادی ہال کے ایک کونے میں پرانے دوستوں کے ساتھ یادگار ملاقات رہی۔ پرانے دوست بھی کیا عجب تحفہ ہیں۔ بچپن کے ساتھی۔ ڈویژنل پبلک سکول کے کلاس فیلوز۔ خالد باجوہ، ڈاکٹر احسن سلیم، جاوید اصغر، شاہد منیر۔ جاوید اصغر اوائل عمری سے لیکر اب تک زندگی سے اتنا بھرپور انسان ہے، کہ اسکے نام کے ساتھ ڈاکٹر لکھنا بھول گیا۔ غفور چوہدری سے رابطہ ارشد اور خالد باجوہ کی وجہ سے ہوا۔ پر اب ان سے بھی مروت کا رشتہ قائم ہے۔ خالد باجوہ بچپن سے لیکر اب تک، ہمیشہ بزرگ بزرگ سا رہا ہے۔ خالص دیسی اور مخلص آدمی۔ بچپن میں، طالبعلم اور باجوہ، سائیکل اکٹھے چلاتے رہے۔ چچا اسلم مرحوم کی موٹر سائیکل پر پھر ہم دونوں نے بائیک چلانا سیکھی۔ خالد، ہاسٹل میں رہتا تھا۔ ڈویژنل پبلک سکول کے متعلق اسکی معلومات کم از کم میرے سے بہت زیادہ ہیں۔ وہ تو چوبیس گھنٹے کا طالبعلم تھا۔ ہم لوگ تو دوپہر کے بعد گھر واپس آ جاتے تھے۔ باجوہ نے گھر سے باہر رہنا ابتدائی عمر سے ہی سیکھ لیا تھا۔ اوائل عمری سے حد درجہ خود اعتمادی تھی اور آج بھی ہے۔ باجوہ نے تیس برس پہلے کاروبار کرنا شروع کیا اور اب تو خیر وہ بے حد مستحکم حالات میں ہے۔ مگر سب کچھ حاصل کرنے کے بعد بھی اس میں وہی خاندانی عاجزی اور نجابت موجود ہے۔ خالد کی سماجی زندگی کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ وہ بڑے سنجیدہ طریقے سے ہنساتا ہے۔ خدا اسے قائم و دائم رکھے۔

ڈاکٹر جاوید اصغر ایک انسان نہیں بلکہ تحفہ ہے۔کلاس میں ایسی ایسی شرارتیں کرتا تھا کہ ہم سارے بچے ہنس ہنس کے لوٹ پوٹ ہو جاتے تھے۔ویسے بچے کا لفظ لکھتے ہوئے عجیب سی کیفیت ہو رہی ہے۔مگر سفید بالوں یا بالوں کے بغیر ہم جیسے بوڑھے لوگ آج سے پانچ دہائیاں قبل بچے ہی تھے۔ویسے ہر بوڑھے یا جوان انسان کے اندر ایک ننھا منا کھلکھلاتا ہوا بچہ ضرور ہوتا ہے۔اسے زندہ رکھنا چاہیے۔عملی زندگی کے تقاضوں میں سب سے پہلی ذداسی اندرونی بچے ہی کو لگتی ہے۔اسے تھپڑ مار مار کر مصنوعی سنجیدگی کے تابوت میں بند کر دیا جاتا ہے۔مگر جاوید اصغر نے اپنے ساتھ یہ نہیں ہونے دیا۔آج بھی ایک پُرمعنی زندگی گزار رہا ہے۔جذبے اور شرارتوں سے بھرپور۔کلاس روم میں جب استاد بلیک بورڈ پر کچھ لکھنے میں مصروف ہوتے تھے تو جاوید اصغر پچھلی طرف مونہہ کر کے ایسی مزاحیہ شکلیں بناتا تھا کہ سب کو ہنسی آ جاتی تھی۔بے ساختہ ہنسی۔جس پر کنٹرول کرنا ناممکن تھا۔ویسے میرے ذہن میں آج بھی جاوید اصغر کی تمام شرارتیں اماناً محفوظ ہیں۔اسکی ایک قوالی بھی یاد ہے۔جاوید آج ایک کامیاب ڈاکٹر ہے اور بھرپور پریکٹس کر رہا ہے۔اسکے ساتھ ساتھ، پیرامیڈیکل کی تعلیم کیلئے ایک ادارہ بھی احسن طریقہ سے چلا رہا ہے۔جاوید اصغر سے ایک گھنٹہ ملاقات ہم سب کو پبلک سکول کے اسی ماحول میں واپس لے گئی جس میں کسی کو کسی سے کوئی غرض نہیں ہوتی۔کسی کو علم نہیں تھا کہ مقدر کا ہاتھ اسے زندگی میں کس جگہ پر لے جائیگا۔بے لوث سے انسانی رشتے جو بہرحال، اب مکمل طور پر ناپید ہو چکے ہیں۔اب تو ایسے لگتا ہے کہ اکثر لوگ دولت اور صرف دولت کمانے کی اس دوڑ میں مصروف کار ہیں۔جسکی نہ کوئی ابتداء ہے اور نہ کوئی انتہا۔لکھ پتی انسان، کروڑ پتی بننے کیلئے تقریباً پاگل ہو چکا ہے۔کروڑ پتی، اربوں کے گرداب سے باہر نہیں آ رہا۔غریب آدمی اپنی جگہ پر پریشان ہے۔مگر سب سے زیادہ رنج میں سفید پوش طبقے کے لوگ ہیں۔جو رزق حلال میں گزارا کرنے کی بھرپور کوشش کرتے ہیں۔یہ سفید پوش لوگ، اصل پاکستان ہیں۔یہ گھٹ گھٹ کر زندہ رہتے ہیں اور ہر پل دنیا کے رنگ دیکھ کر مرنے کی خواہش کرتے ہیں۔یہ اپنی اولاد کو ہر وہ سہولت نہیں دے پاتے جو دیگر آسودہ طبقے دے سکتے ہیں۔ویسے ایک حقیقت عرض کروں۔آج سے تیس چالیس سال پہلے بھی سماج میں ہر مالی طبقے کے لوگ رہتے تھے۔مگر رہن سہن اس درجہ سادہ تھے کہ سفید پوش اور غریب لوگ، اپنی سفید پوشی میں مست تھے۔دولت مند، اپنی دولت کی نمائش سے کوسوں دور رہتے تھے۔ہر جانب ایک اطمینان کی کیفیت تھی۔طبقاتی تفرق ہرگز ہرگز اتنا زیادہ نہیں تھا۔جسکو عملی طور پر ہم آج بھگت رہے ہیں۔بہت سے لوگوں کو جانتا ہوں جو سولہ کروڑ کی رولز رائس گاڑی رکھنے کے باوجود، اَز حد پریشان ہیں۔دولت انکے لیے بے معنی ہے۔مگر نفسیاتی گرہیں اتنی زیادہ ہیں کہ ہر وقت اَنجانے خوف میں مبتلا رہتے ہیں۔ایک عرض کرتا چلوں۔میرے ایک قریبی دوست بہت بڑی شوگر مل کے مالک ہیں۔انہیں ہر وقت یہ خوف رہتا ہے کہ کوئی انہیں نقصان نہ پہنچا جائے۔اپنے گھر کو قلعہ بنا رکھا ہے۔سفر کے دوران بھی، دس بارہ محافظ ساتھ رکھتے ہیں۔ایک دن میں نے کہا کہ چلو، اکیلے چلتے ہیں اور کسی جگہ پر کھانا کھا کر آتے ہیں۔میں گاڑی چلا رہا تھا۔دوست، ساتھ والی سیٹ پر بیٹھ گئے۔میں نے کسی بھی محافظ کو ساتھ لیجانے سے منع کر دیا۔ایک دو منٹ کیلئے اسکی حالت غیر ہو گئی۔یقین دلایا کہ کچھ نہیں ہوگا۔ہم دونوں، اکیلے دو تین گھنٹے باہر گھومتے رہے۔تھوڑی دیر کے بعد، میرا دوست کہنے لگا کہ مجھے تو واقعی کوئی بھی کچھ نہیں کہہ رہا۔اسکے چہرے پر بھرپور خوشی کا تاثر تھا۔اب یہی ہوتا ہے کہ ہم دونوں کبھی کبھی باہر چلے جاتے ہیں۔گپ شپ لگاتے ہیں۔عام سے لطیفوں پر کھل کر ہنستے ہیں اور واپس آ جاتے

ہیں۔اصل میں زندگی، دولت کے انبار کے اندر پوشیدہ نہیں۔ یہ تو، آسودگی ایک بھرپور کیفیت ہے۔صرف یہ دعا مانگنی چاہیے کہ خدا کسی کے سامنے دستِ سوال کی نوبت نہ آنے دے۔ باقی سب خیر ہے۔زندگی تو گزر ہی جاتی ہے۔

شاہد منیر بھی موجود تھا۔شاہد اور جاوید اصغر، آپس میں قریبی رشتہ دار ہیں۔شاہد کے چہرے پر آج بھی وہی بھول پن ہے جو آج سے دہائیاں پہلے، موجود تھا۔شاہد جب بھی ملتا ہے، مسکراتا ہوا ملتا ہے۔چہرے پر ایک مطمئن جذبے کی لہر ہے۔قناعت سے بھرپور انسان۔ یاد ہے کہ بچپن میں بھی سنجیدگی اور غیر سنجیدگی کے توازن سے آراستہ تھا۔دھیمے لہجے میں بات کرنے کی عادت اسے ہمیشہ سے ہے۔خدا اسے خوش وخرم رکھے۔احسن سلیم ہم سب سے ایک یا دو جماعتیں جونیئر تھا۔شائد ایک جماعت۔دل کا ڈاکٹر ہے اور فیصل آباد کے کامیاب ترین ڈاکٹروں میں شمار کیا جاتا ہے۔انتہائی مہذب شخص۔بچپن سے آج تک میں نے احسن میں ایک متانت پائی ہے۔بے حد نرم دل اور اچھا انسان۔کل بتانے لگا کہ اسکی اور میری والدہ، آپس میں گہری سہیلیاں تھیں۔احسن نے ذکر کیا تو آنکھوں میں بادل سے آ گئے۔خاموش ہو گیا۔اپنی والدہ کس کو عزیز نہیں ہوتی۔مگر یہ بزرگ بھی ایسے دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں، جیسے پکے ہوئے پھل ایک دم زمین پر گر جاتے ہیں۔آناً فاناً نظروں سے اوجھل۔منوں مٹی اوڑھ کر ایک ایسے سفر پر چلے جاتے ہیں جہاں سے کوئی واپس نہیں آتا۔ویسے ایک قطار ہے۔جس میں سب اپنی باری کا انتظار کر رہے ہیں۔مگر مانتا کوئی نہیں۔ویسے موت بھی ایک پُرکشش سفر کی ابتداء ہے۔زندگی کی خوبصورتی اسی نکتے میں پنہاں ہے کہ اس نے ایک دم ختم ہو جانا ہے۔احسن سلیم نے جب والدہ کا ذکر کیا تو کافی دیر تک صرف یہ سوچتا رہا کہ اگر چند سانس مزید مل جاتے تو کیا حرج تھا۔بہرحال جو خدا کی مرضی، وہی ہماری رضا۔جب مالک بلاوا بھیج دے تو پھر کیسی نافرمانی۔ڈاکٹر احسن انکساری سے بھرپور انسان ہے۔اپنے حال میں مست۔ویسے اسکی ایک اور بڑی کامیابی بھی ہے۔اس نے اپنا وزن قطعاً بڑھنے نہیں دیا۔وہ آج بھی عمر میں ہم سے کافی چھوٹا اور جوان نظر آتا ہے۔خدا اسے اسی طرح قائم رکھے۔

فیصل آباد سے لاہور آتے ہوئے مسلسل سوچ رہا تھا کہ پرانے دوستوں جیسے نایاب رشتے اب کہاں میسر آتے ہیں۔ ہر چیز بدل سکتی ہے۔وقت کی تلوار ہمیں تبدیل کر سکتی ہے۔مگر وہ پرانے جذبوں کو مرتے دم تک ختم نہیں کر سکتی۔یہی زندگی کا حسن ہے۔یہی زیست کا پوشیدہ راز ہے۔یہی خوشی کی ایک لہر ہے اور شائد یہی زندگی ہے۔خدا ان دوستوں اور محفلوں کو قائم رکھے۔ویسے واپسی پر میں بے حد اُداس سا تھا۔یہ فسوں ابھی تک قائم ہے۔پر ملاقاتوں کی طوالت نہیں، بلکہ انکی کیفیت اہم ہے۔پرانے دوست بھی کیا بیش بہا تحفے ہیں۔انسان کو دہائیاں کا ذہنی سفر کروانے پر قادر لوگ!

راؤ منظر حیات